Urdu Studies
An international, peer-reviewed, bilingual research journal
ISSN: 2583-8784 (Online)
Vol. 5 | Issue 1 | Year 2025
Pages: 21-29

چودھری محمد نعیم

شمیم حنفی

کہتے ہیں کہ جو لوگ اپنی زمین سے کٹ جاتے ہیں، انھیں نئی زمین آسانی سے قبول نہیں کرتی۔ چودھری محمد نعیم نے بارہ بنکی کی سکونت ترک کر کے اب سے تقریباً چالیس برس پہلے شکاگو بسالیا تھا، جب سے وہیں آباد ہیں اور ہندوستان میں اودھ کے ایک سوئے سوئے سے، لکھنؤ کے مضافاتی علاقے سے، جو ان کا آبائی وطن ہے، ہمیشہ کے لیے دستبردار ہو کر بہت دور جابسے ہیں۔ اب وہ امریکی شہری ہیں۔ سال کے سات آٹھ مہینے شکاگو میں یا جہانِ دگر کے بہت مختلف، بہت متمول، بہت ترقی یافتہ جدید شہروں کی سیاحی میں گزارتے ہیں، باقی تین چار مہینے ہندوستان کے دھول اور دھوپ سے بھرے ہوئے راستوں پر۔ یہاں بھی خوش، وہاں بھی خوش۔ بے اطمینانی اور اضطراب کی ایک مستقل کیفیت یہاں بھی اور وہاں بھی ہے۔ نعیم صاحب نے ایک ساتھ دو دنیاؤں کے تضادات سے جس طرح سمجھوتا کیا ہے شاید کم لوگوں کے بس میں ہو گا۔ لیکن میں نے یہ جو سمجھوتے والی بات کہی، شاید غلط کہی۔ نعیم صاحب کی سوانح کی لغت میں اس لفظ "سمجھوتے" کے لیے گنجائش بہت مشکل سے نکلتی ہے۔ وہ

ISSN: 2583-8784 (Online)
Included in UGC-CARE List since October 2021
Published on August 15, 2025
http://www.urdustudies.in
https://creativecommons.org/licenses/by-nc-nd/4.0/?ref=chooser-v1

بااصول، بے باک، بڑی حد تک کھرّے اور منہ پھٹ قسم کے انسان ہیں۔ ایسا خال خال ہی ہوتا ہے کہ ان کے دل میں کچھ ہو، زبان پر کچھ اور۔

۱۹۷۱ء کے امس بھرے موسم میں، ایک روز وہ اپنے انڈو امریکن بچوں طاہر اور فرح کے ساتھ علی گڑھ میں وارد ہوئے، اس ارادے سے کہ یہ نقل مکانی راس آئی تو یہیں رہ جائینگے۔ ان دنوں پروفیسر آل احمد سرور شعبۂ اردو کے صدر تھے اور انہوں نے تقابلی ادبیات کی ریڈر شپ پر نعیم صاحب کو بلالیا تھا۔ نعیم نے کم و بیش ایک سیشن یونیورسٹی میں گزارا۔ مگر یہ تجربہ انھیں راس نہ آیا۔ ایک صبح میں نے یہ تماشا دیکھا کہ فیکلٹی آف آرٹس کی عمارت کے برآمدے اور راہداری سے وہ دھڑا دھڑ سائیکلیں اٹھا کر باہر فوارے سے ملحق آب زاروں کی طرف اچھال رہے ہیں اور طیش میں ہیں۔ میں نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا تو غصے اور غصے کو ضبط کرنے کے باعث کانپتی ہوئی آواز میں بولے: ”صاحب، حد ہوگئی! یونیورسٹی ہے یا کباڑ خانہ۔ لوگ یہ تک نہیں دیکھتے کہ آنے جانے کا راستہ بھی ہے یا نہیں۔ ہر طرف سائیکلیں پارک کر رکھی ہیں!“ اسی حالت میں ایک خط فیکلٹی کے ڈین کو لکھ بھیجا۔ ان دنوں شعبۂ فلسفہ کے صدر پروفیسر ظفر احمد صدیقی آرٹس فیکلٹی کے سربراہ تھے۔ روز اسی طرح سر جھکائے آڑی ترچھی سائیکلوں سے بچتے بچاتے اپنے دفتر میں داخل ہوتے تھے، مگر بے بس تھے۔ اب ایسی باتوں کا نوٹس کون لیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نعیم کی بیزاری بتدریج بڑھتی گئی۔ اس عرصے میں ان کی بیگم بھی شکاگو سے آئیں اور علی گڑھ کے ماحول کا معائنہ کر کے واپس چلی گئیں۔ بالآخر نعیم نے بھی واپسی کے سفر کا فیصلہ کر لیا۔ پھر وہ دن اور آج کا دن، انھیں دوبارہ اپنے بارہ بنکی کے گھر کو گھر بنانے کا خیال نہیں آیا۔ ہر سال عزیزوں اور اہل خاندان سے ملاقات کے لیے آتے ہیں اور لوٹ جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کبھی کبھی شکاگو کی کسی سرد اور سنسان سہ پہری میں آنکھیں بند کیے کیے کسی پرانی ہندی فلم کا کوئی گیت سن رہے ہوتے ہیں تو اچانک ایک جھرجھری سی آتی ہے، پھر آنکھیں کھولتے ہیں اور اپنے روزمرہ میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

بارہ بانکوں کا شہر بارہ بنکی لکھنؤ سے صرف ۲۷ کلو میٹر کے فاصلے پر آباد ہے۔ مقامی گورنمنٹ ہائی اسکول سے نعیم صاحب نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا۔ اس پریشان اور پراگندہ مزاج یونیورسٹی کے حال سے اس کے ماضی کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اُس زمانے میں، جب نعیم صاحب یہاں سے بی اے کر رہے تھے، یہ یونیورسٹی چار دانگ عالم میں جانی جاتی تھی۔ نعیم صاحب ہر روز صبح شام ریل گاڑی سے لکھنؤ آتے جاتے تھے اور اس دنیا میں چین سے بسر کرتے تھے۔ پھر ان کا انتخاب راک فیلر فاؤنڈیشن کے تحت چھ ہفتے کے لسانیات کے ایک کورس کی تکمیل کے لیے ہو گیا اور وہ دکن کالج (پونا) کی طرف چل پڑے۔ یہ مغرب کی سمت سفر کا پہلا زینہ تھا اور اپنی مانوس دنیا سے ترکِ تعلق کی پہلی دہلیز۔ پھر پونا اور دہرادون ہوتے ہوئے انھوں نے کیلیفورنیا یونیورسٹی، برکلے کا رخ کیا۔ یہ ۱۹۵۷ء کی خزاں کا آخری دور تھا۔ اس سنہ سے مغرب، خصوصاً امریکہ میں اُردو زبان و ادب سے شغف اور ان کی ترویج کا ایک طویل دور شروع ہوا جسے اگر ایک عنوان دیا جاسکتا ہے تو وہ چودھری محمد نعیم کا نام ہے۔ ہمارے ادبی معاشرہ میں اپنی ڈفلی اپنا راگ کا چلن اب اتنا زور پکڑ چکا ہے کہ لوگ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ دوسروں کا امتیاز اپنی جیب میں ڈالنے کے عادی ہوتے جارہے ہیں، سو، "بین الاقوامی ادبی حیثیت" پر اصرار کے فیشن نے ایک معاشرتی ابتذال کی شکل اختیار کرلی ہے۔ نعیم صاحب نے اپنی زبان سے کبھی کوئی دعویٰ نہیں کیا مگر واقعہ یہ ہے کہ شکاگو میں نعیم صاحب نے، وسکانسن میں محمد عمر میمن نے اور انگلستان میں اگر رالف رسل اور ڈیوڈ میتھیوز نے اردو زبان اور ادبیات کی تعمیر اور ترقی کا بیڑا نہ اٹھایا ہوتا تو مغربی دنیا میں اُردو زبان و ادب کی تدریس اور قبولیت کا قصہ یقیناً مختلف ہوتا۔

مغرب میں اردو زبان و ادب کے مسلسل بڑھتے پھیلتے دائرۂ اثر کا جائزہ جب بھی لیا جائے گا، نعیم صاحب کی تصویر بھی بتدریج صاف ہوتی جائے گی۔ وہ ایک خاموش، شرمیلے، اپنی "کارکردگی" کے احساس سے کترا کر چلنے والوں میں سے ہیں۔ ذاتی نوعیت کی گفتگو وہ کبھی نہیں کرتے، کبھی انٹرویو نہیں دیتے، کبھی اپنے علمی اور ادبی کارناموں کی تفصیل نہیں بتاتے اور یہ تک نہیں بتاتے کے اودھ کے ایک

چھوٹے سے قصبے کو چھوڑ کر "جہانِ دیگر" سے تعلق استوار کرنے میں انہوں نے کتنے پاپڑ بیلے۔ بتائیں بھی تو شاید لوگ شک کی نظر سے انھیں دیکھیں گے کیونکہ نعیم صاحب نے ابھی تک اپنے وجود سے بارہ بنکی اور لکھنؤ کی گرد جھاڑی نہیں ہے اور وقت کے ساتھ اپنے آپ کو بدلنے کی کوئی نمائشی جستجو نہیں کی ہے۔ وہ تو بھلا ہو ان کے شاگردوں اور ساتھیوں کا کہ انھوں نے یہ کٹا پھٹا افسانہ اپنی ایک کتاب A Wilderness Of Possibilities کے طور پر مرتب کر دیا ہے۔ اس کتاب کے مرتبین کیتھرین ہینسن [1] اور ڈیوڈ للی ویلڈ [2] ہیں اور اسے اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس نے ۲۰۰۵ء میں شائع کیا ہے۔

نہایت سلیقے سے مرتب کی جانے والی یہ کتاب تین سو صفحوں پر مشتمل ہے۔ اسے دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے کا ذیلی عنوان Urdu Literature and the Political Imagery ہے۔ اس میں کُم کُم سانگری، [3] مظفر عالم [4] اور سنجے سبرامنیم [5] سے لے کر باربرا میٹکاف [6] تک کے چھے مضامین شامل ہیں جن کے موضوعات نعیم کی خاص دلچسپی کے ہیں، یعنی کہ ادب، عمرانیات، حکائی قصے،

[1] Kathryn Hansen, Professor Emerita. حال ہی میں آپ کی نئی کتاب Pure Entertainment: Parsi Theater, Gender, and Performance کی اشاعت ہوئی ہے۔

[2] David Lelyveld, Professor of History (Retired) at William Paterson University, United States. آپ کیتھرین ہینسن کے ساتھ A Wilderness of Possibilities: Urdu Studies in Transnational Perspective (2005) کو مرتب کیا تھا۔ Aligarh's First Generation: Muslim Solidarity in British India (1978, reprinted 2003) آپ کی ایک معروف تصنیف ہے۔

[3] Kumkum Sangari, Vilas Research Professor, University of Wisconsin–Milwaukee.

[4] Muzaffar Alam, George V. Bobrinsky Professor in South Asian Languages and Civilizations at the University of Chicago.

[5] Sanjay Subrahmanyam, Distinguished Professor & Irving and Jean Stone Endowed Chair in Social Sciences, Department of History, University of California, Los Angeles.

[6] Barbara Daly Metcalf (born September 13, 1941), Professor Emeritus of history at the University of California, Davis.

سیاست، معاشرہ، اور مشرق و مغرن کی آویزش۔ دوسرے حصے کا ذیلی عنوان The Critical project and its Revision ہے۔ اس حصے میں پانچ تنقیدی نوعیت کے مضامین ہیں، شمس الرحمن فاروقی، آدتیہ بہل،[7] کارلا پیٹی وچ،[8] فرانسس پریچٹ[9] اور سید اکبر حیدر[10] کے لکھے ہوئے۔ کتاب کے شروع میں نعیم کے سوانح کا ایک خاکہ ہے اور اخیر میں ان کے مطبوعہ مضامین، کتابوں، ترجموں، تبصروں کی تفصیل۔

اس کتاب میں شامل سوانحی تفصیلات سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ برکلے میں نعیم صاحب نے ۱۹۶۱ء میں نئے سرے سے ایم اے لسانیات کی تکمیل کی۔ اس کے کچھ عرصے بعد شکاگو یونیورسٹی کی دعوت پر وہ پہلے مشرقی مطالعات سے، پھر لسانیات کے شعبوں سے وابستہ رہے۔ بالآخر جنوب ایشیائی زبانوں اور تہذیبوں کا مرکز ان کا دارالامان مقرر ہوا۔ اس کے سائے میں ایک لمبی عمر گزر گئی۔ یہاں کچھ اور ممتاز رفیقوں کے علاوہ نعیم صاحب کو معروف شاعر اے کے رامانجن[11] کا ساتھ بھی میسر آیا۔ اسی یونیورسٹی کی کہکشاں میں ادب کے نوبیل انعام یافتگان سال بیلو[12] اور کوئٹزری[13] جیسے منتخب افراد بھی شامل تھے۔ شکاگو یونیورسٹی کا ماضی اور حال دونوں یکساں طور پر شاندار رہے ہیں۔ تقریباً ستر نوبل انعام یافتہ افراد کی ذہنی سرگرمیوں کا حصہ بننے والی یہ یونیورسٹی ہمارے عہد کی سب سے ممتاز اور

[7] Aditya Bahl, Department of English, UCLA.
[8] Carla Petievich, retired professor of History, Urdu and Women's Studies now affiliated with the South Asia Center at the University of Texas at Austin.

[9] Frances Pritchett کولمبیا یونیورسٹی۔ مغرب میں اردو کی معروف دانشور۔

[10] Syed Akbar Hyder ٹکساس یونیورسٹی میں ساؤتھ ایشیا انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر۔ معروف دانشور اور جریدہ Journal of Urdu Studies کے مدیر ہیں۔

[11] Attipate Krishnaswami Ramanujan (۱۹۲۹-۱۹۹۳)۔

[12] Saul Bellow (۱۹۱۵-۲۰۰۵)۔ ۱۹۷۶ کا نوبل انعام برائے ادب۔

[13] John Maxwell Coetzee (پ ۱۹۴۰)۔ ۲۰۰۳ کا نوبل انعام برائے ادب۔

پرکشش شخصیتوں میں سے ایک، سوسن سونٹیگ [۱۴] کا ٹھکانہ بھی رہ چکی ہے۔ Against Interpretation کی شہرۂ آفاق مصنفہ کا ابھی سال بھر پہلے انتقال ہوا۔ سوسن نے ہندوستان کا سفر بھی کیا تھا۔ نعیم کے اپنے سوانح کی روشنی میں، شکاگو یونیورسٹی سے وابستگی کی ابتدا سے لے کر اب تک کی جو زندگی انھوں نے اس شہر غریب میں بسر کی، اس پر نظر ڈالی جائے تو ایک دلچسپ کہانی آزادی کے بعد کی اداس نسل کے کردار کی، ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس کہانی کا زمانی اور مکانی کینوس چالیس برسوں کی زیادہ سے مدت پر پھیلا ہوا ہے۔ کتاب کے فاضل مرتبین کے لفظوں میں:

> Professor Naim played a major role in establishing Urdu studies in the U.S. Naim's influence has touched anyone interested in Urdu literature and wider context of cultural history associated with Urdu. Although he did not set out to be an institution builder, virtually every American student of Urdu has built from the foundations that he set down over more than forty years. Throughout this period, Naim stretched the conventional expectations of an academic career. His work has been personal, idiosyncratic, experimental, and widely various in its interests, grounded in the integrity of a continual curiosity, open-mindedness, and generosity of spirit.

اسی دوران نعیم نے اپنے معروف انگریزی جرنل "محفل" (Mahfil) کی داغ بیل بھی ڈالی جو آگے چل کر جرنل آف ساؤتھ ایشین لٹریچر کے نام سے جانا گیا،[۱۵] اور ان دنوں محمد عمر میمن کی ادارت میں وسکانسن سے شائع ہو رہا ہے، Annual of Urdu Studies کے طور پر۔

[۱۴] Susan Lee Sontag (۱۹۳۳-۲۰۰۴)۔

[۱۵] "محفل" کی اشاعت ۱۹۶۳ سے ۱۹۷۲ کے درمیان ہوئی۔ "جرنل آف ساؤتھ ایشین لٹریچر" ۱۹۷۳ سے ۲۰۰۰ تک شائع ہوتا رہا۔ پروفیسر چودھری کی ادارت میں "اینوئل اوف اردو اسٹڈیز" کی اشاعت ۱۹۸۰ میں شروع ہوئی۔ پہلا شمارہ ۱۹۸۱ میں منظر عام پر آیا۔ پروفیسر محمد عمر میمن ۱۹۹۳ سے اس کے مدیر رہے۔ آخری شمارہ ۲۰۱۴ میں شائع ہوا۔

اردو زبان و ادب کے ایک استاد، مترجم اور ادیب سے قطع نظر، نعیم کے شناس نامے میں ان کا ہندوستانی ہونا، مسلمان ہونا اور ایک بے چین، مشتعل، گرد و پیش کے ماحول میں کسی قدر گھبرائے ہوئے، افسردہ اور شاید مایوس دانشور کے طور پر عالمگیر قومی اور بین الاقوامی مسئلوں اور سوالوں سے جوجھتے ہوئے انسان کی حیثیت سے زندگی گزارنا بھی شامل ہے۔ اردو کے عام لکھنے والوں اور استادوں کے برعکس، نعیم صاحب کا سروکار زندہ انسانی معاملات اور جیتے جاگتے حقائق سے ہے۔ ایک ادیب کو پمفلٹ باز ہونے سے بھی گھبرانا نہیں چاہیے۔ یہ بات ہماری اس پریشاں ساماں دنیا کے اس مرحوم مفسر نے کہی تھی جو ژاں پال سارتر کے نام سے ہماری (بیسویں صدی) دنیا کے اضطراب اور ملال کی جیتی جاگتی نشانی بن گیا اور جس کے سو سالہ یوم پیدائش کا جشن اس وقت دنیا بھر میں منایا جا رہا ہے۔ نعیم ادب کے "خود مکتفیانہ" تصور سے ذرا بھی مناسبت نہیں رکھتے گرچہ ادب کی آزادانہ حیثیت کے قائل ہیں۔The Poem Itself کے عنوان سے انھوں نے (1969) Mahfil 5:4 میں غالب کو جس طرح سمجھنے کی کوشش کی تھی، اس سے یہ التباس پیدا ہوتا ہے کہ روایتی ہیئت پرستوں کی طرح وہ بھی غالب کی لفظیات اور علائم و استعارات کے 'محبس' میں ان کے سرکش اور گردوں شکار تخیل کا احاطہ کر رہے ہوں گے۔ لیکن اس طرح کے مطالعات کا موضوع تو انھوں نے قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے افسانے سے لے کر راشد، فیض، پروین شاکر، عذرا عباس، کشور ناہید تک نئی پرانی بہت سی تخلیقات کو بنایا ہے۔ نعیم اس وقت اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے والوں کی پہلی صف میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ترجمے کا عمل ان کے یہاں صرف کسی شعری یا نثری تخلیق کے لباس کی تبدیلی نہیں ہے۔ وہ اصل متن کے ایک ایک لفظ، ایک ایک نشان کے امکانات پر اچھی طرح سوچ بچار کرنے کے بعد کسی متن کے تاریخی، معاشرتی، عمرانیاتی، جمالیاتی، فکری مناسبات کو پرکھنے کے بعد اس کے ترجمے کا بیڑا اٹھاتے ہیں۔ لسانیات میں ریاضت نے انھیں یہ بھی بتایا ہے کہ قوموں اور انسانوں کی طرح لفظ بھی مسافر ہوتے ہیں، مختلف موسموں سے گزرتے ہیں اور ان کا باطن وقت کے ساتھ بدلتا بھی رہتا ہے، اس لیے ضروری نہیں کہ کسی افسانے یا شعر میں جو لفظ استعمال ہوا ہے، اس کے معنی

لغات کے پابند بھی ہوں۔ شاعری اور تخلیقی نثر سے ہٹ کر نعیم کے علمی ترجموں کا جائزہ لیا جائے تب بھی ان کی اسی دقت نظر کا احساس ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ابھی تک ان کا سب سے مہتم بالشان کارنامہ "ذکر میر" کا انگریزی ترجمہ، تعارف اور تحشیہ ہے۔ ترجمے سے قطع نظر، تدوین متن کی اس سطح تک اردو ادبیات کے بس اکا دکا علما اور محققین پہنچ سکے ہیں۔

نعیم صاحب کی دلچسپی کا خاص میدان ہمارے زمانے کی اجتماعی زندگی (بالخصوص مسلمانوں کی) کو درپیش ذہنی، جذباتی لسانی، تہذیبی، سیاسی مسئلوں کے ساتھ ساتھ انیسویں اور اٹھارویں صدی کا ادب اور سماجی ماحول ہے۔ سودا اور میر سے لے کر ڈپٹی نذیر احمد اور امام بخش صہبائی تک، نعیم کے ادبی شعور نے ایک پر پیچ سفر کیا ہے۔ ہندوستانی تہذیبی نشاۃ ثانیہ سے مربوط اور منسوب بڑے واقعات (اصلاحی انجمنوں اور تعلیمی اداروں کا قیام وغیرہ) کے علاوہ انحراف اور اجتہاد کی زیریں اور ضمنی لہریں تک، ان کے لیے یکساں کشش رکھتی ہیں۔ انھوں نے حکائی روایتوں، بہ ظاہر عام رسموں، خاندانی مناقشات اور معاملات، یہاں تک کہ درباری قصوں اور لطیفوں کا بھی سنجیدہ مطالعہ کیا ہے۔ گہری سچائیاں کبھی کبھی اجتماعی زندگی اور معاشرے کی فروعات کے ڈھیر میں چھپ جاتی ہیں اور ان تک رسائی سے پہلے بہت کچھ خس و خاشاک کو الٹ پلٹ کر دیکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ شاید اسی لیے نعیم معمولی، علاقائی اور مقامی اہمیت رکھنے والے ورناکیولر پریس کا جائزہ بھی اسی سنجیدگی کے ساتھ لیتے ہیں جس طرح قومی روزناموں کا۔ ان کے شاگردوں، کیتھرین ہینسن اور ڈیوڈ للی ویلڈ نے اپنی مرتبہ کتاب کے اخیر میں نعیم کی جو بلیوگرافی دی ہے اس کے تنوع اور صدرنگی کو دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے۔ انھوں نے ادب، لسانیات، تاریخ، سماجیات، سیاست، معاشرت—ہر میدان میں ایسی کسی بھی چھوٹی بڑی واردات سے صرف نظر نہیں کیا جو ہمارے زمانے پر یا ہماری زندگی پر اثرانداز ہوئی ہو۔ معاملہ شاہ بانو کا ہو یا پاکستان کے فیوڈل اسٹرکچر میں وڈیلوں کے ہاتھوں ذلیل ہوتی ہوئی انسانی اقدار کا، یا مسلکی تنازعوں کا، یا اقلیتوں کا، نعیم کا ذہن کبھی چپکا اور لاتعلق ہو کر نہیں بیٹھتا۔ انھوں نے لاپروائی اور کسی قدر غیر ذمے داری کا ثبوت دیا تو اپنی انفرادی تخلیقی صلاحیتوں کے معاملے میں۔ انگریزی میں

ان کی چھوٹی چھوٹی کہانیوں کا ایک مجموعہ Five+One بھاشا پرکاشن، دہلی سے ۱۹۷۶ میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس سوال کا جواب نعیم کو اپنے آپ سے بھی پوچھنا چاہیے!

پچھلے دنوں ہندوستان اور پاکستان سے ان کی کئی کتابیں سامنے آئیں، Ambiguities of Urdu Heritage (1999), Urdu Texts and Contexts (2004)، وغیرہ، اور ہندی اردو سے انگریزی میں کئی ترجمے شائع ہوئے، مگر ان میں بھی نعیم کی اس کوتاہی کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے—ان کے شاگرد جو دنیا کے دور دراز علاقوں میں بچھے ہوئے ہیں، نعیم کو اپنا دوست مگر ایک سخت گیر استاد سمجھتے ہیں۔ شاید اسی لیے کسی نے اس بھید سے پردہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی ہے—جہاں تک میرا تعلق ہے، میں نے چھے کہانیوں کو کہانیاں سمجھ کر نہیں، بلکہ اس انوکھی کتاب کے کچھ حصوں کے طور پر پڑھا تھا جسے زندگی نے چودھری محمد نعیم کے وجود پر نقش کر رکھا ہے۔ اردو میں اس طرح کی کہانیاں بہت کم لکھی گئی ہیں! نعیم نے اس کتاب کا انتساب سرابوں کے نام کیا تھا، عرفی کے اس شعر کے ساتھ کہ:

ز نقش تشنہ لبی داں بہ عقل مناز دلت فریب گر از جلوۂ سراب نہ خورد

(ہم نفسوں کی بزم میں، شمیم حنفی۔ نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، ۲۰۰۶)